

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقسیم القرآن

النمل

نام | دوسرے رکوع کی چوتھی آیت میں وَاذِ النَّمْلَ کا ذکر آیا ہے۔ سورہ کا نام اسی سے ماخوذ ہے یعنی وہ سورہ جس میں النمل کا قصہ مذکور ہے۔ یا جس میں النمل کا لفظ وارد ہوا۔ زمانہ نزول | مضمون اور انداز بیان مکہ کے دور متوسط کی سورتوں سے پوری مشابہت رکھتا ہے۔ اور اس کی تائید روایات سے بھی ہوتی ہے۔ ابن عباس اور جابر بن زید کا بیان ہے کہ پہلے سورہ شعراء نازل ہوئی، پھر النمل، پھر القصص۔

موضوع اور مباحث | یہ سورہ دو خطبوں پر مشتمل ہے۔ پہلا خطبہ آغاز سورہ سے چوتھے رکوع کے خاتمے تک ہے۔ اور دوسرا خطبہ پانچویں رکوع کی ابتدا سے سورہ کے اختتام تک پہلے نجلہ میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رہنمائی سے صرف وہی لوگ نائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اس کی بشارتوں کے مستحق بھی صرف وہی لوگ ہیں جو ان حقیقتوں کو تسلیم کریں جنہیں یہ کتاب اس کائنات کی بنیادی حقیقتوں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے، اور پھر ان پینے کے بعد اپنی عملی زندگی میں بھی اطاعت و اتباع کا رویہ اختیار کریں لیکن اس راہ پر آنے اور چلنے میں جو چیز سب سے بڑھ کر مانع ہوتی ہے وہ انکارِ آخرت ہے، کیونکہ یہ آدمی کو غیر ذمہ دار، نیدہ نفس اور فریضہ حیات و نیا بنا دیتا ہے، جس کے بعد آدمی کا خدا کے آگے جھکنا اور اپنے نفس کی خواہشات پر اخلاقی پابندیاں برداشت کرنا ممکن نہیں رہتا۔ اس تمہید کے بعد تین قسم کی سورتوں کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

ایک نمونہ فرعون اور سردارانِ قوم ثمود اور سرکشانِ قوم لوط کا ہے جن کی سیرت

فکرِ آخرت سے بے نیازی اور نتیجہ نفس کی بندگی سے تعمیر ہوئی تھی۔ یہ لوگ کسی نشانی کو دیکھ کر بھی ایمان لانے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ یہ اُلٹے ان لوگوں کے دشمن ہو گئے جنہوں نے ان کو خیر و صلاح کی طرف بلایا۔ انہوں نے اپنی اُن بد کاریوں پر بھی پورا اصرار کیا جن کا گھٹنا و ناپن کسی صاحبِ عقل انسان سے پوشیدہ نہیں ہے۔ انہیں عذابِ الہی میں گرفتار ہونے سے ایک لمحہ پہلے بھی ہوش نہ آیا۔

دوسرا نمونہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہے جن کو خدا نے دولت، حکومت اور شوکت و شہمت سے اس پیمانے پر نوازا تھا کہ کفارِ مکہ کے سردار اس کا خواب بھی نہ دیکھ سکتے تھے۔ لیکن اس سب کے باوجود چونکہ وہ اپنے آپ کو خدا کے حضور جواب دہ سمجھتے تھے، اور انہیں احساس تھا کہ انہیں جو کچھ بھی حاصل ہے خدا کی عطا سے حاصل ہے، اس لیے ان کا سر ہر وقت منعمِ حقیقی کے آگے جھکا رہتا تھا اور کبرِ نفس کا کوئی ادنیٰ شائبہ تک ان کی سیرت و کردار میں نہ پایا جاتا تھا۔

تیسرا نمونہ ملکہ سبا کا ہے جو تاریخِ عرب کی نہایت مشہور دولت مند قوم پر حکمران تھی۔ اس کے پاس تمام وہ اسباب جمع تھے جو کسی انسان کو غرورِ نفس میں مبتلا کر سکتے ہیں جن چیزوں کے بل پر کوئی انسان گھمنڈ کر سکتا ہے وہ سردارانِ قریش کی بہ نسبت لاکھوں سبب سے زیادہ اسے حاصل تھیں۔ پھر وہ ایک مشرک قوم سے تعلق رکھتی تھی۔ تقلیدِ آبائی کی بنا پر بھی، اور اپنی قوم میں اپنی سرداری برقرار رکھنے کی خاطر بھی، اس کے لیے دینِ مشرک کو چھوڑ کر دینِ توحید اختیار کرنا اس سے بہت زیادہ مشکل تھا۔ جتنا کسی عام مشرک کے لیے ہو سکتا ہے۔ لیکن جب اس پر حق واضح ہو گیا تو کوئی چیز اسے قبولِ حق سے نہ روک سکی۔ کیونکہ اس کی گراہی محض ایک مشرک ماحول میں آنکھیں کھولنے کی وجہ سے تھی۔ نفس کی بندگی اور خواہشات کی غلامی کا مرض اس پر مسلط نہ تھا۔ خدا کے حضور جواب دہی کے احساس سے اس کا ضمیر فارغ نہ تھا۔

دوسرے طبقے میں سب سے پہلے کائنات کے چند نمایاں ترین مشہور حقائق کی طرف اشارہ کر کے کفار مکہ سے پے در پے سوال کیا گیا ہے کہ بتاؤ، یہ حقائق اس شرک کی شہادت سے رچے ہیں جس میں تم مبتلا ہو، یا اس توحید پر گواہ ہیں جس کی دعوت اس قرآن میں تمہیں دی جا رہی ہے؛ اس کے بعد کفار کے اصل مرض پر انگلی رکھ دی گئی ہے کہ جس چیز نے ان کو اندھا بنا رکھا ہے، جس کی وجہ سے وہ سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہیں دیکھتے اور سب کچھ سن کر بھی کچھ نہیں سنتے وہ دراصل آخرت کا انکار ہے۔ اسی چیز نے ان کے سینے تلکی کے کسی مسئلے میں بھی کوئی سنجیدگی باقی نہیں چھوڑی ہے، کیونکہ جب ان کے نزدیک آخرت کا سب کچھ مٹی ہو جاتا ہے، اور حیات دنیا کی اس ساری تگ و دو کا حاصل کچھ بھی نہیں ہے تو آدمی کے لیے پھر حق اور باطل سب یکساں ہیں۔ اس کے لیے اس سوال میں سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں رہتی کہ اس کا نظام حیات راستی پر قائم ہے یا ناراستی پر۔

لیکن اس بحث سے مقصود یہاں نہیں ہے کہ جب یہ لوگ غفلت میں مگن ہیں تو انہیں دعوت دینا بے کار ہے۔ بلکہ دراصل اس سے مقصود سونے والوں کو جھجھوڑ کر جگانا ہے۔ اس لیے چھٹے اور ساتویں رکوع میں پے در پے وہ باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں جو لوگوں میں آخرت کا احساس بیدار کریں، اس سے غفلت کے نتائج پر متنبہ کریں، اور انہیں اس کی آمد کا اس طرح یقین دلائیں جس طرح ایک آدمی اپنی آنکھوں دیکھی بات کا اس شخص کو یقین دلانا ہے جس نے اسے نہیں دیکھا ہے۔

خاتمہ کلام میں قرآن کی اصل دعوت، یعنی خدائے واحد کی بندگی کی دعوت، نہایت مختصر، مگر انتہائی موثر انداز میں پیش کر کے لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ اسے قبول کرنا تمہارے اپنے لیے نافع اور اسے رد کرنا تمہارے اپنے لیے ہی نقصان دہ ہے۔ اسے ماننے کے لیے اگر خدا کی وہ نشانیاں دیکھنے کا انتظار کرو گے جن کے سامنے آجانے

کے بعد مانے بغیر چارہ نہ رہے گا، تو یاد رکھو کہ وہ فیصلے کا وقت ہوگا، اس وقت ماننے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

ط۔س۔ یہ آیات ہیں قرآن اور کتابِ مبین کی، ہدایت اور بشارت ایمان لانے والوں کے لیے جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ ایسے لوگ ہیں جو آخرت کا یقین رکھتے

۱۱۔ کتابِ مبین کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب اپنی تعلیمات اور اپنے احکام اور ہدایات کو بائیں واضح طریقے سے بیان کرتی ہے۔ دوسرا مطلب یہ کہ وہ حق اور باطل کا فرق نمایاں طریقے سے کھول دیتی ہے۔ اور ایک تیسرا مطلب یہ بھی ہے کہ اس کا کتاب الہی ہونا ظاہر ہے، جو کوئی اسے آنکھیں کھول کر پڑھے گا اس پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا لکھرا ہوا کلام نہیں ہے۔

۱۲۔ یعنی یہ آیات ہدایت اور بشارت ہیں۔ ہدایت کرنے والی اور بشارت دینے والی کہنے کے بجائے انہیں بجائے خود ہدایت اور بشارت کہا گیا جس سے رہنمائی اور بشارت کے وصف میں ان کے کمال کا اظہار مقصود ہے۔ جیسے کسی کو آپ سخی کہنے کے بجائے مجسم سخاوت اور حسین کہنے کے بجائے از مترنا پا سخن کہیں۔

۱۳۔ یعنی قرآن مجید کی یہ آیات رہنمائی بھی صرف انہی لوگوں کی کرتی ہیں اور انجام تک کی خوشخبری بھی صرف انہی لوگوں کو دیتی ہیں جو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کر لیں، خدائے واحد کو اپنا ایک ہی اللہ اور رب مان لیں، قرآن کو خدا کی کتاب تسلیم کر لیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی برحق مان کر اپنا پیشوا بنا لیں، اور یہ عقیدہ بھی اختیار کر لیں کہ اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جس میں ہم کو اپنے اعمال کا حساب دینا اور جزائے اعمال سے دوچار ہونا ہے۔ پھر ان چیزوں کو محض مان کر نہ رہ جاؤ بلکہ عملاً اتباع و اطاعت کے لیے تیار رہو جس کی آئین علامت یہ ہے کہ وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ یہ دونوں شرطیں جو لوگ پوری کر دیں گے انہی کو قرآن کی آیات دنیا میں زندگی کا سیدھا راستہ بتائیں گی اس

ہیں۔ برعکس اس کے، جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ان کے لیے درحقیقت ہم نے ان کے کرتوتوں
براہ راستہ کے ہر مرحلے میں ان کو صحیح اور غلط کا فرق سمجھائیں گی، اس کے ہر مڑ پر انہیں غلط راہوں کی طرف جانے
سے بچائیں گی، اور ان کو یہ اطمینان بخشیں گی کہ راستہ رومی کے تلمیذ دنیا میں خواہ کچھ بھی ہوں، آخر کار ابدی
اور دائمی نجات اسی کی بدولت انہیں حاصل ہوگی اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی سے سرفراز ہوں گے۔ یہ بالکل
ایسا ہی ہے جیسے ایک معلم کی تعلیم سے وہی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو اس پر اعتماد کر کے واقعی اس کی
شاگردی قبول کرے اور اس کی ہدایات کے مطابق کام بھی کرے۔ ایک ڈاکٹر سے استفادہ وہی مرض
کر سکتا ہے جو اسے اپنا معالج بنائے اور دوا اور دیرینہ وغیرہ کے معاملہ میں اس کی ہدایات پر عمل کرے۔
اسی صورت میں معلم اور ڈاکٹر یہ اطمینان دلا سکتے ہیں کہ آدمی کو نتائج مطلوبہ حاصل ہوں گے۔

بعض لوگوں نے اس آیت میں **بِتُؤْتُونَ الزَّكَاةَ** کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہ اخلاق کی پاکیزگی آنتینا
کریں۔ لیکن قرآن مجید میں اتنا مت صلوات کے ساتھ اتنا زکوٰۃ کا لفظ جہاں بھی آیا ہے، اس سے مراد وہ
زکوٰۃ ادا کرنا ہے جو نماز کے ساتھ اسلام کا دوسرا رکن ہے۔ حلا وہ بریں زکوٰۃ کے لیے آیتا، کا لفظ استعمال
ہوتا ہے جو زکوٰۃ مال ادا کرنے کے معنی متعین کر دیتا ہے، کیونکہ عربی زبان میں پاکیزگی اختیار کرنے کے لیے
تزکی کا لفظ بولا جاتا ہے نہ کہ اتنا زکوٰۃ۔ دراصل یہاں جو بات ذہن نشین کرنی مقصود ہے وہ یہ کہ قرآن
کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایمان کے ساتھ عملاً اطاعت و اتباع کا رویہ اختیار کرنا بھی ضروری ہے
اور اتنا مت صلوات و اتنا زکوٰۃ وہ پہلی علامت ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ آدمی نے واقعی اطاعت
قبول کر لی ہے۔ یہ علامت جہاں غائب ہوئی وہاں فوراً یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی سرکش ہے، حاکم
کو حاکم چاہے اس نے مان لیا ہو، مگر حکم کی پیروی کے لیے وہ تیار نہیں ہے۔

لہذا اگرچہ آخرت کا عقیدہ ایمانیت میں شامل ہے اور اس بنا پر ایمان لانے والوں سے مراد
ظاہر ہے کہ وہی لوگ ہیں جو قرآن مجید اور رسالت کے ساتھ آخرت پر بھی ایمان لائیں، لیکن ایمانیت کے
ضمن میں اس کے آپ سے آپ شامل ہونے کے باوجود یہاں اس عقیدے کی اہمیت ظاہر کرنے کے
لیے خاص طور پر زور دے کر اسے الگ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ جو

کو خوشنما بنا دیا ہے، اس لیے وہ ٹھیکتے پھرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے بری سزا ہے اور لوگ آخرت کے قائل نہ ہوں ان کے لیے اس قرآن کے بتانے ہوئے راستے پر چلنا بلکہ اس پر قدم رکھنا بھی محال ہے۔ کیونکہ اس طرز فکر کے لوگ طبعاً اپنا معیار خیر و شر صرف انہی نتائج سے متعین کرتے ہیں جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے یا ہو سکتے ہیں۔ اور ان کے لیے کسی ایسی نصیحت و ہدایت کو قبول کرنا ممکن نہیں ہوتا جو انجامِ اخروی کو سود و زیباں اور نفع و نقصان کا معیار قرار دے کر خیر و شر کا تعین کرتی ہو۔ ایسے لوگ تو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم پر کان ہی نہیں دھرتے بلکہ اگر کسی وجہ سے وہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں شامل ہو بھی جائیں تو آخرت کا یقین نہ ہونے کے باعث ان کے لیے ایمان و اسلام کے راستے پر ایک قدم چلتا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس راہ میں پہلی ہی آتائش جب پیش آئے گی، جہاں دنیوی فائدے اور اخروی نقصان کے تقاضے انہیں دو مختلف سمتوں میں کھینچیں گے تو وہ بے تکلف دنیا کے فائدے کی طرف کھینچ جائیں گے اور آخرت کے نقصان کی ذرہ برابر پروا نہ کریں گے، خواہ زبان سے وہ ایمان کے کتنے ہی دعوے کرتے رہیں۔

۵۔ یعنی خدا کا قانونِ فطرت یہ ہے، نفسیاتِ انسانی کی قطری منطق یہی ہے کہ جب آدمی زندگی اور اس کی سعی و عمل کے نتائج کو صرف مادی دنیا تک ہی دیکھ سکے گا، جب وہ کسی ایسی عدالت کا قائل نہ ہوگا جہاں انسان کے پورے کارنامہ حیات کی جانچ پڑتال کر کے اس کے حسن و قبح کا آخری اور قطعی فیصلہ کیا جائے والا ہو۔ اور جب وہ موت کے بعد کسی ایسی زندگی کا قائل نہ ہوگا جس میں حیاتِ دنیا کے اعمال کی حقیقی قدر و قیمت کے مطابق ٹھیک ٹھیک جزا و سزا دی جانے والی ہو، تو لازماً اس کے اندر ایک مادہ پرستانہ نقطہ نظر نشوونما پائے گا۔ اسے حق اور باطل، شرک اور توحید، نیکی اور بدی، اخلاق اور بد اخلاقی کی ساری بحثیں سرسری معنی نظر آئیں گی۔ جو کچھ اسے اس دنیا میں لذت و عیش اور مادی ترقی و خوشحالی اور قوت و اقتدار سے ہمکنار کرے وہی اس کے نزدیک بھلائی ہوگی قطع نظر اس سے کہ وہ کوئی فلسفہ حیات اور کوئی طرز زندگی اور نظامِ اخلاق ہو۔ اس کو حقیقت اور صداقت سے دراصل کوئی غرض ہی نہ ہوگی۔ اس کی اصل مطلوب صرف حیاتِ دنیا کی زمینیں اور کامرانیاں ہوں گی جن کے حصول کی فکر سے ہر وادی میں یہ ٹھیکتی پھریگی۔

آخرت میں یہی سب سے زیادہ خسانے میں رہنے والے ہیں۔ اور (اسے محمدؐ) بلاشبہ تم یہ قرآن ایک حکیم و عظیم مستی کی طرف سے پار ہے ہو۔

(انہیں اس وقت کا قصہ سناؤ) جب موسیٰؑ نے اپنے گھروالوں سے کہا

اور اس مقصد کے لیے جو کچھ بھی وہ کرے گا اسے اپنے نزدیک بڑی خوبی کی بات سمجھے گا اور اٹان لوگوں کو بے وقوف سمجھے گا جو اس کی طرح دنیا طلبی میں منہمک نہیں ہیں اور اخلاق و بد اخلاقی سے بے نیاز ہو کر ہر کام کر گزرنے میں پاک نہیں ہیں کسی کے اعمال بد کو اس کے لیے خوشنما بنا دینے کا یہ فعل قرآن مجید میں کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور کبھی شیطان کی طرف۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتا ہے تو اس سے مراد، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہ ہوتی ہے کہ فطرۃ اللہ کے مطابق جو شخص یہ نقطہ نظر اختیار کرتا ہے اسے زندگی کا یہ ہنچار خوش آندہ محسوس ہوا ہے۔ اور جب وہ شیطان کی طرف منسوب ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس طرح فکر اور طرز عمل کو اختیار کر لینے والے آدمی کے سامنے شیطان ہر وقت ایک خیالی حسرت پیش کرتا رہتا ہے اور اسے خوب اطمینان دلاتا ہے کہ شاباش بر خوردار بہت اچھے جا رہے ہو۔

لہذا اس بری منزل کی صورت، وقت اور جگہ کا تعین نہیں کیا گیا ہے کیونکہ یہ اس دنیا میں بھی مختلف افراد کو وہوں اور قوموں کو بے شمار مختلف طریقوں سے ملتی ہے، اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت عین موت کے دروازے پر بھی اس کا ایک حصہ ظالموں کو پہنچتا ہے، موت کے بعد عالم برزخ میں بھی اس سے آدمی بچا رہتا ہے، اور پھر روزِ حشر سے تو اس کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے گا جو پھر کہیں جا کر ختم نہ ہوگا۔

یعنی یہ کوئی ہوائی باتیں نہیں ہیں جو اس قرآن میں کی جا رہی ہیں، اور نہ یہ کسی انسان کے قیاس و رائے پر مبنی ہیں بلکہ انہیں ایک حکیم و عظیم ذات اتفاقاً کر رہی ہے جو حکمت و دانائی اور علم و دانش میں کامل ہے، جسے اپنی خلق کے مصالح اور ان کے ماضی و حال اور مستقبل کا پورا علم ہے، اور جس کی حکمت بندوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے بہترین تدبیر اختیار کرتی ہے۔

یہ اس وقت کا قصہ ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین میں آٹھ دس سال گزارنے کے بعد اپنے اہل عیال کو ساتھ لیکر کوئی ٹھکانہ تلاش کرنے جا رہے تھے۔ مدین کا علاقہ خلیج عقبہ کے کنارے عرب اور جزیرہ نما سینا

کہ مجھے ایک آگ سی نظر آئی ہے، میں ابھی یا تو وہاں سے کوئی خبر لے کر آتا ہوں یا کوئی انکارا
چُن لاتا ہوں تاکہ تم لوگ گرم ہو سکو۔ وہاں جو پہنچا تو ندا آئی کہ مبارک ہے وہ جو اس آگ

کے سوا محل پر واقع تھا۔ وہاں سے چل کر حضرت موسیٰ خیرہ نمائے سینا کے جنوبی حصے میں اُس مقام پر پہنچے
جو اب کوہ سینا کے نام سے مشہور ہے۔ اسی کے دامن میں وہ واقعہ پیش آیا جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔
یہاں جو قصہ بیان کیا جا رہا ہے اس کی تفصیلات اس سے پہلے سورہ طہ (رکوع ۱) میں گزر چکی
ہیں اور آگے سورہ قصص (رکوع ۴) میں آ رہی ہیں۔

لہٰذا نوحائے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رات کا وقت اور جاڑے کا موسم تھا۔ اور حضرت موسیٰ
ایک اجنبی علاقے سے گزر رہے تھے جس سے انہیں کچھ زیادہ واقفیت نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنے گھر
والوں سے فرمایا کہ میں جا کر معلوم کرتا ہوں یہ کونسی مٹی ہے جہاں آگ جل رہی ہے، آگے کہہ کر ہر رات
جاتے ہیں اور کون کون سی بستیاں قریب ہیں۔ تاہم اگر وہ بھی ہماری ہی طرح کوئی چلتے پھرتے مسافر ہوئے
جن سے کوئی معلوم حاصل نہ ہو سکیں تو کم از کم میں کچھ انکار سے ہی بے آؤنگا کہ تم لوگ آگ جلا کر کچھ گرمی حاصل
نالے سورہ قصص میں ہے کہ ندا ایک درخت سے آ رہی تھی، فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ
اس سے جو صورت معاملہ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ وادی کے کنارے ایک خطے میں آگ سی لگی ہوئی تھی
مگر نہ کچھ جل رہا تھا نہ کوئی دھواں اٹھ رہا تھا اور اس آگ کے اندر ایک ہر ابھر درخت کھڑا تھا جس پر سے
یہ ایک یہ ندا آنی شروع ہوئی۔

یہ ایک عجیب معاملہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ پیش آتا رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم
جب پہلی مرتبہ نبوت سے سرفراز کیے گئے تو غار حراء کی تنہائی میں یہ ایک ایک فرشتہ آیا اور اس نے
اللہ کا پیغام پہنچانا شروع کر دیا۔ حضرت موسیٰ کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی کہ ایک شخص سفر کرتا ہوا
ایک جگہ ٹھہرا ہے، دُور سے آگ دیکھ کر راستہ پوچھنے یا انکا پانچنے کی غرض سے آتا ہے اور بکلفت اللہ
رب العالمین کی ہر قیاس و گمان سے بالا ذات اس سے مخاطب ہو جاتی ہے۔ ان مواقع پر ضرور
کوئی ایسی غیر معمولی کیفیت خارج میں بھی اور انبیاء علیہم السلام کے نفس میں بھی ہوتی ہوگی جس کی

میں ہے اور جو اس کے ماحول میں ہے۔ پاک ہے اللہ سب جہان والوں کا پروردگار۔ اے موسیٰ، یہ میں ہوں اللہ، زبردست اور دانا۔ اور پھینک تو فنا اپنی لالچی، جو نہی کہ موسیٰ نے دکھا لالچی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے تو پیٹھ پھیر کر بھاگا اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اے موسیٰ، دونوں میرے حضور رسول ڈرا نہیں کرتے، الایہ کہ کسی نے تصور کیا ہو۔ پھر اگر برائی کے بعد اس نے

بتا پرا نہیں اس امر کا یقین حاصل ہو جاتا ہو گا کہ یہ کسی جن یا شیطان یا خود ان کے اپنے ذہن کا کوئی کرشمہ نہیں ہے، نہ ان کے جو اس کوئی دھوکا کھا رہے ہیں، بلکہ فی الواقع یہ خداوند عالم یا اس کا فرشتہ ہی ہے جو ان سے ہمکلام ہے۔

اللہ اس موقع پر سبحان اللہ ارشاد فرماتے سے دراصل حضرت موسیٰ کو اس بات پر متنبہ کرنا مقصود تھا کہ یہ معاملہ کمال درجہ تنزیہ کے ساتھ پیش آرہا ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اللہ رب العالمین اس سخت پر بیٹھا ہو، یا اس میں حلول کر آیا ہو، یا اس کا نور مطلق تمہاری بنیائی کے حدود میں سما گیا ہو، یا کوئی زبان کسی منہ میں حرکت کر کے یہاں کلام کر رہی ہو، بلکہ ان تمام محدود تئوں سے پاک اور منزہ ہوتے ہوئے بذات خود تم سے مخاطب ہے۔

۱۲ سورہ اعراف اور سورہ شعراء میں اس کے لیے ثعبان (اڑو ہے) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یہاں اسے "جان" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جو چھوٹے سانپ کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جسامت میں وہ اڑو ہا تھا، مگر اس کی حرکت کی تیزی ایک چھوٹے سانپ جیسی تھی۔ اسی مفہوم کو سورہ طہ میں حَبِطَةٌ تَسْعَى ددوڑتے ہوئے سانپ کے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

۱۳ یعنی میرے حضور اس امر کا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ رسول کو کوئی گزند پہنچے۔ رسالت کے منصبِ عظیم پر مقرر کرنے کے لیے جب میں کسی کو اپنی پیشی میں بلاتا ہوں تو اس کی حفاظت کا خود ذمہ دار ہوتا ہوں۔ اس لیے خواہ کیسا ہی کوئی غیر معمولی معاملہ پیش آئے رسول کو بے خوف اور مطمئن رہنا چاہیے کہ اس کے لیے وہ کسی طرح ضرر رساں نہ ہوگا۔

۱۴ یہ استثنا متصل بھی ہو سکتا ہے اور منقطع بھی متصل ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ خوف

جھلائی سے اپنے فعل کو بدل لیا تو میں معاف کرنے والا مہربان ہوں۔ اور ذرا اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں تو ڈالو۔ چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے۔ یہ دو نشانیاں، نوشتانیوں میں سے ہیں فرعون اور اس کی قوم کی طرف (لے جانے کے لیے) وہ بڑے بدکردار لوگ ہیں۔“

کی معقول وجہ اگر ہو سکتی ہے تو یہ کہ رسول سے کوئی قصور سرزد ہوا ہو۔ اور منقطع ہونے کی صورت میں مراد یہ ہوگی کہ میرے حضور تو کسی کو بھی کوئی خطرہ نہیں ہے جیت تک کہ آدمی قصور وار نہ ہو

۱۵۱ یعنی قصور کرنے والا بھی اگر تو یہ کر کے اپنے رویے کی اصلاح کر لے اور برے عمل کے بجائے نیک عمل کرنے لگے تو میرے ہاں اس کے لیے عفو و درگزر کا دروازہ کھلا ہے۔ اس موقع پر یہ بات اذنا فرمانے سے مقصود ایک تنبیہ بھی تھی اور بشارت بھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نادانستگی میں ایک قبیلے کو قتل کر کے مصر سے نکلے تھے۔ یہ ایک قصور تھا جس کی طرف لطیف اشارہ فرمایا گیا۔ پھر جس وقت یہ قصور اچانک بلا ارادہ ان سے سرزد ہوا تھا اس کے بعد فوراً ہی انہوں نے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لی تھی کہ رَبِّ اِنِّی ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ اَسْءَاۤءَ الَّذِیْنَ کَانَ عَلَیَّ مِنْ قَبْلِہِ ۗ اِنِّیْ اَنۡتَ اَرْحَمُ الرَّحِیْمِۙ (میرے رب! میں نے اپنے آپ کو ظلم کر کے گنہگار بنا لیا، مجھے معاف فرما، تو سب سے مہربان اور بخشنے والا ہے) اور اللہ تعالیٰ نے اسی وقت انہیں معاف بھی فرمادیا تھا۔ فَخَفَا کَانَ الْقَصَصُ ۗ (آیت ۱۶)۔ اب یہاں اسی معافی کی بشارت انہیں دی گئی ہے۔ گویا مطلب اس تقریر کا یہ ہوا کہ اے موسیٰ میرے حضور تمہارے لیے ڈرنے کی ایک وجہ تو ضرور ہو سکتی تھی، کیونکہ تم سے ایک قصور سرزد ہو گیا تھا، لیکن جب تم اس برائی کو جھلائی سے بدل چکے ہو تو میرے پاس تمہارے لیے اب مغفرت اور رحمت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کوئی سزا دینے کے لیے اس وقت میں تمہیں نہیں بلایا ہے بلکہ بڑے بڑے معجزات دیکر میں تمہیں ایک کارِ عظیم پر بھیجنے والا ہوں۔

۱۵۲ سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے کہ موسیٰ کو ہم نے صریح طور پر نظر آنے والی نوشتانیاں (۱) نَسَخَ الْاٰیٰتِ بِیِّنٰتٍ (عطا فرمائی تھیں)۔ اور سورہ اعراف میں ان کی تفصیل یہ بیان کی گئی ہے (۱) اللہ جوازد با بن جاتی تھی۔ (۲) ہاتھ جو بغل سے سورج کی طرح چمکتا ہوا نکلتا تھا۔ (۳) جادو گروں کو برسرِ عام شکست دینا (۴) حضرت موسیٰ کے پیشگی اعلان کے مطابق سارے ملک میں قحط۔ (۵) طوفان (۶) ٹڈی دل

مگر جب ہماری کھلی کھلی نشانیوں ان لوگوں کے سامنے آئیں تو انہوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ انہوں نے سرسرمہ اور غرور کی راہ سے ان نشانیوں کا انکار کیا حالانکہ دل ان کے قائل ہو چکے تھے۔ اب دیکھ لو کہ ان مفسدوں کا انجام کیسا ہوا۔

(دوسری طرف) ہم نے داؤد و سلیمان کو علم عطا کیا۔ اور انہوں نے کہا کہ شکر ہے اس خدا کا

(۷) تمام غنّے کے ذخیروں میں سرسرمایاں اور انسان و حیوان سب میں جوئیں (۸) مینڈکوں کا طوفان (۹) اور خون۔
 ۱۰ قرآن میں دوسرے مقامات پر بیان کیا گیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کے اعلان کے مطابق کوئی بلائے عام مصر پر نازل ہوتی تھی تو فرعون حضرت موسیٰ سے کہتا تھا کہ تم اپنے خدا سے دعا کر کے اس بلا کو ٹلو اور پھر جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہم مان لیں گے۔ مگر جب وہ بلا مل جاتی تھی تو فرعون اپنی اسی سبٹ دھرمی پرنل جاتا تھا (الاعراف آیت ۱۳۶۔ الزخرف: آیت ۴۹-۵۰)۔ بائبل میں بھی اس کا ذکر موجود ہے (خروج باب ۸ تا ۱۰)۔ اور ویسے بھی یہ بات کسی طرح تصور میں نہ آ سکتی تھی کہ ایک پورے ملک پر مخط اور طوفان اور ٹنڈی دلوں کا ٹوٹ پڑنا اور مینڈکوں اور سرسرموں کے بے شمار لشکروں کا امٹنا کسی جادو کا کرشمہ ہو سکتا ہے۔ یہ ایسے کھنڈے ہوئے معجزے تھے جن کو دیکھ کر ایک بے وقوف سے بیوقوف آدمی بھی یہ سمجھ سکتا تھا کہ پیغمبر کے کہنے پر ایسی ملک گیر بلاؤں کا آنا اور پھر اس کے کہنے پر ان کا دور ہو جانا صرف اللہ رب العالمین ہی کے تصرف کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰ نے فرعون سے صاف صاف کہا: **وَيَا تَحَاكُمُ لَقَدْ عَلِمْتَمَا أَنزَلَهُوَالْآدَاتِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ**، تو تو بجان چکا ہے کہ یہ نشانیوں مالک زمین و آسمان کے سوا کسی اور نے نازل نہیں کی ہیں (زنبی اسرائیل، آیت ۱۰۲)۔ لیکن جس وجہ سے فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں نے جان بوجھ کر ان کا انکار کیا وہ یہ تھی کہ **أَنوْمِنُ لِبَشَرٍ مِّثْلِنَا وَقُوَّةُ مَا لَنَا عَابِدُونَ**، کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں کی بات مانیں حالانکہ ان کی قوم ہماری غلام ہے؟ (المؤمنون، آیت ۱۴۷)

۱۱ یعنی حقیقت کا علم۔ اس بات کا علم کہ درحقیقت ان کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہے، جو کچھ ہے اللہ کا عطیہ ہے، اور اُس پر تصرف کرنے کے جو اختیارات بھی اُن کو بخشے گئے ہیں انہیں اللہ ہی کی مرضی

جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی۔ اور داؤد کا وارث سلیمان ہوا۔
 کے مطابق استعمال کیا جانا چاہیے، اور اس اختیار کے صحیح و غلط استعمال پر انہیں مالک حقیقی کے حضور مجاہد
 کرنی ہے۔ یہ علم اس جہالت کی ضد ہے جس میں فرعون مبتلا تھا۔ اس جہالت نے جو سیرت تعمیر کی تھی اس کا
 نمونہ اوپر مذکور ہوا۔ اب بتایا جاتا ہے کہ یہ علم کیسی سیرت کا نمونہ تیار کرتا ہے۔ بادشاہی، دولت، حشمت
 طاقت دونوں طرف یکساں ہے۔ فرعون کو بھی یہ ملی تھی اور داؤد و سلیمان علیہما السلام کو بھی۔ لیکن جہالت
 اور علم کے فرق نے ان کے درمیان کتنا عظیم الشان فرق پیدا کر دیا۔

۹۱ یعنی دوسرے مومن بندے بھی ایسے موجود تھے جن کو خلافت عطا کی جاسکتی تھی۔ لیکن یہ بیماری
 کوئی ذاتی خوبی نہیں بلکہ محض اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اس مملکت کی فرمانروائی کے لیے منتخب فرمایا۔
 ۹۲ وراثت سے مراد مال و جائداد کی وراثت نہیں بلکہ نبوت اور خلافت میں حضرت داؤد
 کی جانشینی ہے۔ مال و جائداد کی میراث اگر بالفرض تقسیم بھی ہوئی ہو تو وہ حضرت سلیمان کے لیے
 خاص نہ ہو سکتی تھی، کیونکہ حضرت داؤد کی دوسری اولاد بھی موجود تھی۔ اس لیے اس آیت کو اس جہالت
 کی تردید میں پیش نہیں کیا جاسکتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ لا نورث ما ترکنا صدقہ
 ہم انبیاء کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی، جو کچھ ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے۔ (بخاری، کتاب فرض الخمس، اور
 ان النبی لا یورث انما میراثہ فی فناء المسلمین والمساکین۔) نبی کا وارث کوئی نہیں ہوتا۔
 جو کچھ وہ چھوڑتا ہے وہ مسلمانوں کے فقراء اور مساکین میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (مسند احمد، مرویات
 ابو بکر صدیق حدیث ۱۱۷۰)

حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کا اصل عبرانی نام سلوون
 تھا جو سلیم کا ہم معنی ہے۔ ۹۱۵ قبل مسیح میں حضرت داؤد کے جانشین ہوئے اور ۹۱۶ ق م تک
 تقریباً ۴۰ سال فرمانروا رہے۔ ان کے حالات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم ص ۹۰-۹۱
 اور حاشی سورہ انبیاء رکوع ۶-۱۱ کے حدود سلطنت کے متعلق ہمارے مفسرین نے بہت مبالغہ سے
 کام لیا ہے۔ وہ انہیں دنیا کے بہت بڑے حصے کا حکمراں بتاتے ہیں، حالانکہ ان کی مملکت صرف موجودہ

اور اس نے کہا: لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں۔
یہ شک یہ لاشد کا، نمایاں فضل ہے۔ سلیمان کے لیے جن اور انسان اور پرندوں کے لشکر جمع
کیے گئے تھے۔ اور وہ پورے ضابطہ میں رکھے جاتے تھے۔ (ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کوچ

فلسطین و شرق اردن پر مشتمل تھی اور شام کا ایک حصہ بھی اس میں شامل تھا۔ ملاحظہ ہو نقشہ ملک سلیمان
تفسیر القرآن جلد دوم ص ۵۹۸)

۱۱۳۰ بائبل اس ذکر سے خالی ہے کہ حضرت سلیمان کو پرندوں اور جانوروں کی بولیسوں کا علم دیا گیا تھا۔
لیکن نئی اسرائیل کی عیالیا میں اس کی مراحت موجود ہے (جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۱۱ ص ۴۳۹)۔
۱۱۳۱ یعنی اللہ کا دیا جاے پاس سب کچھ موجود ہے۔ اسے لفظی معنوں میں لینا درست نہیں ہے بلکہ
اس سے مراد اللہ کے بخشے ہوئے مال و دولت اور ساز و سامان کی کثرت ہے۔ یہ بات حضرت سلیمان
نے فخر یہ نہیں فرمائی تھی بلکہ اللہ کے فضل اور اس کی عطا و بخشش کا شکر یہ ادا کرنا مقصود تھا۔

۱۱۳۲ بائبل میں اس کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے کہ جن حضرت سلیمان کے لشکر دن میں شامل تھے اور وہ ان
سے خدمت لیتے تھے۔ لیکن تلمود اور ربیبوں کی روایات میں اس کا تفسیلی ذکر ملتا ہے (جیوش انسائیکلو پیڈیا
ج ۱۱ ص ۴۴۰)۔ موجودہ زمانہ کے بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے اٹری چوٹی کا زور لگایا ہے کہ جن اور
طیر سے مراد جنات اور پرندے نہیں ہیں بلکہ انسان ہی ہیں جو حضرت سلیمان کے لشکر میں مختلف کام کرتے
تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ جن سے مراد پہاڑی قبائل کے وہ لوگ ہیں جنہیں حضرت سلیمان نے مسخر کیا تھا اور وہ ان
کے ہاں حیرت انگیز طاقت اور محنت کے کام کرتے تھے۔ اور طیر سے مراد گھوڑ سواروں کے دستے ہیں
جو پیدل دستوں کی بہ نسبت بہت زیادہ تیزی سے نقل و حرکت کرتے تھے۔ لیکن یہ قرآن مجید میں تاویل
کی بدترین مثالیں ہیں۔ قرآن یہاں جن انس اور طیر، تین الگ الگ اقسام کے لشکر بیان کر رہا ہے اور
تینوں پر ال تعریف جنس کے لیے لایا گیا ہے۔ اس لیے لامحالہ الجن اور الطیر، الانس میں شامل نہیں
ہو سکتے بلکہ وہ اس سے مختلف دو الگ اجناس ہی ہو سکتی ہیں۔ علاوہ بریں کوئی شخص جو عربی زبان سے
قدہ برابر بھی واقفیت رکھتا ہو، یہ تصور نہیں کر سکتا کہ اس زبان میں جس لفظ الجن بول کر انسانوں کا

کر رہا تھا، یہاں تک کہ جب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچا تو ایک چیونٹی نے کہا: اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔

کوئی گروہ، یا محض الطیروں کے سواروں کا رسالہ کبھی مراد لیا جاسکتا ہے اور کوئی عرب ان الفاظ کو سن کر ان کے یہ معنی سمجھ سکتا ہے۔ محض محاورے میں کسی انسان کو اس کے فوق العادہ کام کی وجہ سے جن، یا کسی عورت کو اس کے حسن کی وجہ سے پڑی، اور کسی تیز رفتار آدمی کو پرندہ کہہ دینا یہ معنی نہیں رکھتا کہ اب جن کے معنی طاقت ور آدمی اور پری کے معنی حسین عورت اور پرندے کے معنی تیز رفتار انسان کے ہو جائیں۔ ان الفاظ کے یہ معنی تو مجازی ہیں نہ کہ حقیقی اور کسی کلام میں کسی لفظ کو حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنوں میں صرف اسی وقت استعمال کیا جاتا ہے، اور سننے والے بھی ان کو مجازی معنوں میں صرف اسی وقت لے سکتے ہیں جبکہ اس پاس کوئی واضح قرینہ ایسا موجود ہو جو اس کے مجاز ہونے پر دلالت کرتا ہو۔ یہاں آخر کو نسا قرینہ پایا جاتا ہے جس سے یہ گمان کیا جاسکے کہ جن اور طیر کے الفاظ اپنے حقیقی لغوی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں؛ بلکہ آگے ان دونوں گروہوں کے ایک ایک فرد کا حال اور کام بیان کیا گیا ہے وہ تو اس تاویل کے بالکل خلاف ہی ایک عریض قرینہ ہے۔ کسی شخص کا دل اگر قرآن کی بات پر یقین نہ کرنا چاہتا ہو تو اسے صاف کہنا چاہیے کہ میں اس بات کو نہیں مانتا۔ لیکن یہ بڑی اخلاقی بزدلی اور علی خیانت ہے کہ آدمی قرآن کے صاف صاف الفاظ کو ٹوڑ مروڑ کر اپنے من مانے معنی پر ڈھالے اور یہ ظاہر کرے کہ وہ قرآن کے بیان کو مانتا ہے۔ حالانکہ اصل قرآن جو کچھ بیان کرتا ہے وہ اسے نہیں بلکہ خود اپنے زبردستی گھڑے ہوئے مفہوم کو مانتا ہے۔

۱۱۔ اس آیت کو بھی آج کل کے بعض مفسرین نے تاویل کے خراپہ پر چڑھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وادی النمل سے مراد چیونٹیوں کی وادی نہیں ہے بلکہ یہ ایک وادی کا نام ہے جو شام کے علاقے میں تھی اور نمل کے معنی ایک چیونٹی کے نہیں ہیں بلکہ یہ ایک قبیلہ کا نام ہے۔ اس طرح وہ آیت کا مطالبہ یہ بیان کرتے ہیں کہ "جب حضرت سلیمان وادی النمل میں پہنچے تو ایک نمل نے کہا کہ اے قبیلہ نمل کے لوگو...۔" لیکن یہ بھی ایسی تاویل ہے جس کا ساتھ قرآن کے الفاظ نہیں دیتے۔ اگر مفسرین

سلیمان اس کی بات پر مسکراتے ہوئے منہس ٹپا اور بولا۔ "اے میرے رب، مجھے
 وادی النمل کو اس ولوی کا نام مان لیا جائے، اور یہ بھی مان لیا جائے کہ وہاں بنی النمل نام کا کوئی قبیلہ رہتا تھا،
 تب بھی یہ بات عربی زبان کے استعمالات کے بالکل خلاف ہے کہ قبیلہ نمل کے ایک فرد کو نمل کہا جائے۔
 اگرچہ جانوروں کے نام پر عرب کے بہت سے قبائل کے نام ہیں، مثلاً کلب، اسد وغیرہ۔ لیکن کوئی عرب قبیلہ
 کلب کے کسی فرد کے متعلق قال کلب (ایک کتے نے یہ کہا) یا قبیلہ اسد کے کسی شخص کے متعلق قال اسد
 (ایک شیر نے کہا) ہرگز نہیں بولے گا۔ اس لیے بنی النمل کے ایک فرد کے متعلق یہ کہنا کہ قالت نملۃ
 (ایک چوٹی یہ بولی) قطعاً عربی محاورہ و استعمال کے خلاف ہے۔ پھر قبیلہ نمل کے ایک فرد کا بنی النمل
 کو پکار کر یہ کہنا کہ "اے نملیو، اپنے گھروں میں گھس جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان کے لشکر تم کو کھیل ڈالیں
 اور انہیں خبر بھی نہ ہو" بالکل بے معنی ہے۔ انسانوں کے کسی گروہ کو انسانوں کا کوئی لشکر بے خبری میں
 نہیں کچلا کرتا۔ اگر وہ حملے کی نیت سے آیا ہو تو گھروں میں گھسنا حاصل ہے۔ حملہ آور اس کے گھروں میں
 گھس کر اسے زیادہ اچھی طرح کھلیں گے۔ اور اگر وہ محض کوچ کرتا ہو تو اس کے بیٹے میں راستہ صاف
 چھوڑ دینا کافی ہے۔ کوچ کرنے والوں کی لپیٹ میں اگر انسانوں کو نقصان تو پہنچ سکتا ہے، مگر یہ نہیں ہو سکتا
 کہ چلتے ہوئے انسان بے خبری میں انسانوں کو کھیل ڈالیں۔ لہذا اگر بنی النمل کوئی انسانی قبیلہ ہوتا اور
 اس کا کوئی فرد اپنے قبیلے کے لوگوں کو خبردار کرنا چاہتا تو حملے کے خطرے کی صورت میں وہ کہتا کہ "اے
 نملیو، بھاگ چلو اور پہاڑوں میں پناہ لو تا کہ سلیمان کے لشکر قبیلہ تباہ نہ کر دیں" اور حملے کا خطرہ نہ ہونے
 کی صورت میں وہ کہتا کہ "اے نملیو راستہ سے ہٹ جاؤ تاکہ تم میں سے کوئی شخص سلیمان کے لشکروں کی
 بھپیٹ میں نہ آجائے"

یہ تو وہ غلطی ہے جو اس تاویل میں عربی زبان اور مضمون عبارت کے اعتبار سے ہے۔ یہی یہ بات
 کہ وادی النمل دراصل اس وادی کا نام تھا، اور وہاں بنی النمل نامی کوئی قبیلہ رہتا تھا، یہ محض ایک مفروضہ
 ہے جس کے لیے کوئی علمی ثبوت موجود نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اسے وادی کا نام قرار دیا ہے انہوں
 نے خود یہ تصریح کی ہے کہ اسے چوٹیوں کی کثرت کے باعث یہ نام دیا گیا تھا۔ قنادہ اور مقاتل کہتے ہیں

قابو میں رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین کو واہ بارض الشام کتیرا النمل، وہ ایک وادی ہے سرزمین شام میں جہاں چیونٹیاں بہت ہیں لیکن تاریخ و جغرافیہ کی کسی کتاب میں اور آثار قدیمہ کی کسی تحقیقات میں یہ تذکرہ نہیں ہے کہ اس وادی میں بنی النمل نامی کوئی قبیلہ بھی رہتا تھا یہ صرف ایک من گھڑت ہے جو اپنی تاویل کی گاڑی چلانے کے لیے وضع کر لی گئی ہے۔

بنی اسرائیل کی روایات میں بھی یہ قصہ پایا جاتا ہے، مگر اس کا آخری حصہ قرآن کے خلاف ہے اور حضرت سلیمان کی شان کے خلاف بھی ہے۔ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت سلیمان جب ایک وادی سے گزر رہے تھے جس میں چیونٹیاں بہت تھیں تو انہوں نے سنا کہ ایک چیونٹی پکار کر دوسری چیونٹیوں سے کہہ رہی ہے کہ اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ ورنہ سلیمان کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں گے۔ اس پر حضرت سلیمان نے اس چیونٹی کے سامنے بڑے تکبر کا اظہار کیا اور جواب میں اس چیونٹی نے ان سے کہا کہ تمہاری حقیقت کیا ہے، ایک حقیر لوہند سے تو تم پیدا ہوئے ہو۔ یہ سن کر حضرت سلیمان شرمندہ ہو گئے (حیوش انسائیکلو پیڈیا، ج ۱۱، ص ۴۴۰)۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کس طرح بنی اسرائیل کی غلط روایات کی تصحیح کرتا ہے اور ان گندگیوں کو صاف کرتا ہے جو انہوں نے خود اپنے پیغمبروں کی سیرتوں پر ڈال دی تھیں ان روایات کے متعلق مغربی مستشرقین بے شرمی کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن نے سب کچھ ان سیرتوں کو بیاہٹل عقل حقیقت سے یہ بات کچھ بھی بعید نہیں ہے کہ ایک چیونٹی اپنی جنس کے افراد کو کسی آتے ہوئے خطرے سے خبردار کرے اور بلوں میں گھس جانے کے لیے کہے۔ رہی یہ بات کہ حضرت سلیمان نے اس کی بات کیسے سن لی، تو جس شخص کے حواس کلام وحی جیسی لطیف چیز کا ادراک کر سکتے ہوں، اس کے لیے چیونٹی کے کلام جیسی کثیف (CRUDE) چیز کا ادراک کر لینا کوئی بڑی مشکل بات نہیں ہے۔

۵۲۵ اصل الفاظ میں رِبِّ اَوْزُرْ عِنِّي۔ وزر کے اصل معنی عربی زبان میں روکنے کے ہیں۔ اس موقع پر حضرت سلیمان کا یہ کہنا کہ اَوْزُرْ عِنِّي اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ (مجھے روک کہ میں تیرے احسان کا شکر ادا کروں، ہمارے نزدیک دراصل یہ معنی دیتا ہے کہ آے میرے رب جو عظیم الشان نعمتیں اور قابلیتیں

پر کیا ہے اور ایسا عمل صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں میں داخل کرے۔

تو نے مجھے دی ہیں وہ ایسی ہیں کہ اگر میں ذرا سی غفلت میں بھی مبتلا ہو جاؤں تو حد بندگی سے خارج ہو کر اپنی کبر مائی کے تھپڑ میں نہ معلوم کہاں سے کہاں نکل جاؤں۔ اس لیے اے میرے پروردگار تو مجھے قابو میں رکھ تاکہ میں کافر نعمت بننے کے بجائے شکر نعمت پر قائم رہوں۔

۲۶ صالح بندوں میں داخل کرنے سے مراد غالباً یہ ہے کہ آخرت میں میرا انجام صالح بندوں کے ساتھ ہو اور میں ان کے ساتھ جنت میں داخل ہوں۔ اس لیے کہ آدمی جب عمل صالح کرے گا تو صالح تو وہ آپ سے آپ ہو گا ہی، البتہ آخرت میں کسی کا جنت میں داخل ہونا محض اس کے عمل صالح کے بل بوتے پر نہیں ہو سکتا بلکہ یہ اللہ کی رحمت پر موقوف ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لن یدخل احدکم الجنة عملہ۔ تم میں سے کسی کو بھی محض اس کا عمل جنت میں نہیں پہنچا دیگا۔ عرض کیا گیا کہ ولا انت یا رسول اللہ یہ کیا حضور کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ فرمایا ولا تا الا ان یتخمدنی اللہ تعالیٰ برحمتہ۔ ہاں میں بھی محض اپنے عمل کے بل بوتے پر جنت میں نہ چلا جاؤں گا جب تک اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے نہ ڈھانک لے۔

حضرت سلیمان کی یہ دعا اس موقع پر بالکل بے محل ہو جاتی ہے اگر انمل سے مراد انسانوں کا کوئی قبیلہ لے لیا جائے اور نملۃ کے معنی قبیلہ نمل کے ایک فرد کے لیے جائیں۔ ایک بادشاہ کے شکر تیار سے ڈر کر کسی انسانی قبیلہ کے ایک فرد کا اپنے قبیلہ کو خطرہ سے خبردار کرنا آخر کوئی ایسی غیر معمولی بات ہے کہ وہ جلیل القدر بادشاہ اس پر خدا سے یہ دعا کرنے لگے۔ البتہ ایک شخص کو اتنی زبردست قربت اور اک حاصل ہونا کہ وہ دور سے ایک چیونٹی کی آواز بھی سن لے اور اس کا مطلب سمجھ جائے، ضرور ایسی بات ہے جس سے آدمی کے غرور نفس میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو۔ اس صورت میں حضرت سلیمان کی یہ دعا بے محل ہو سکتی ہے۔